سیّد بادشاہ ملک غیؔر
پی ایچ ۔ڈی اسکالر شعبہ اردو،
نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز ، اسلام آباد

مشتاق احمد یوسفی کا ہمزاد (مرزا عبدالودود بیگ)

Syed Badshah-e-Mulk Ghair
Ph.D Scholar, Urdu Department,
National University of Modern Languages, Islamabad .

Mushtaq Ahmad Yousafi 's Hamzad (Mirza Abdul Wadood Baig)

The great prose writer Mushtaq ahmad yousafi writes about Mirza Abdul Wadood Baig in the foreword of his own book "Chiragh talay." Here he calls him "Mara Hamzad". He himself weaves the character of Mirza abdul Wadood Baig with some distinguished characteristics and conveys the message that his own humour and irony are reflected in the person of Mirza abdul wadood Baig. As a writer yousafi expresses his own attitude,character and style in the impression what Mirza abdul wadood Baig owns. In this article the author has critically interpreted the reflective person of yousafi in the form of Mirza abdul wadood Baig .

مشتاق احمد یوسفی نے کتاب ''چراغ تلے'' کا دیباچہ ''پہلا پتھر'' کے نام سے خود قلم بند کیا ہے۔آخر میں مصنف نے مرزا عبدالودود بیگ کا تعارف ان الفاظ میں کیا ہے۔

''رخصت ہونے سے قبل مرزا عبدالودود بیگ کا تعارف کراتا جاؤں یہ میرا ہمزاد ہے۔
دُعا ہے خدا اس کی عمر و اقبال میں ترقی دے''۔(۱)

یاد رہے کہ ساتھ پیدا ہونے والے، سایہ اور ہمیشہ ساتھ رہنے والے روایتی شیطان کو ہمزاد کہا جاتا ہے۔یوں مصنف نے یہاں پر ایک ایسے آدمی و کردار کی توضیح کی ہے جو اصل میں ''نفس'' ہی ہے۔اب قاری کو پوری طرح آزادی

ہے کہ وہ اس کردار کو مختلف موضوعات اور عنوانات کے تحت باریک بینی سے پڑھ لیں یا پھر اس کو امارہ، لوامہ یا مطمئنہ کا نام دے۔ ایک کردار کا اصل کام یہ ہے کہ وہ حقیقی آئینہ دکھادے۔ حال، ماضی اور مستقبل کو مدنظر رکھ کر ایک طرف اُن گورکھ دھندوں اور ناہمواریوں کو ظاہر کردے جن کی وجہ سے انسانی اقدار آئے روز پامال ہو رہی ہوں اور دوسری جانب اُن صفات و اعمال کی تشریح ممکن بنائے جن کے ہونے سے سماج و حیات کو مساوات انسانیت کی جلا نصیب ہو رہی ہو۔ مشتاق احمد یوسفی کا خاص کمال یہ ہے کہ اُس نے مرزا عبدالودود بیگ کے پیچھے اپنا چہرہ رکھا ہے۔ یہ صورت بظاہر طنز و مزاح کے رُوپ میں جلوہ گر ہے مگر مصنف نے اسی کردار کے ذریعے بصیرت و فراست کی ایک سنجیدہ دنیا بھی دکھائی ہے جو اُس کا اصل منشا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے جب بھی اور جس حصے میں بھی اس کردار کی بات کی ہے تو لگتا ہے کہ بس اسی کی ضرورت تھی نیز یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ واحد کردار ہے جو موجودہ صورتحال سے صحیح طور پر نمٹ سکتا ہے۔ چراغ تلے میں ''پڑیے گر بیمار'' کے تحت معاشرے کے اُن لوگوں کو دکھاوے کی روپ میں ظاہر کیا گیا ہے جو تیماردار اور دوست کہلاتے ہیں۔ یہ اگر چہ مختلف طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں مگر سب کے سب ''لکیر کے فقیر اور کاغذی معالج'' کا عکس لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں پر مصنف نے مرزا عبدالودود بیگ کو ایک ایسے دوست و تیماردار کی شکل میں دکھایا ہے جو تندرستی کو جرائم سے منسوب کرتا ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ

> ''لیکن مرزا عبدالودود بیگ کا انداز سب سے نرالہ ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اُنہیں میری دلجوئی مقصود ہوتی ہے یا اس میں ان کے فلسفہ حیات و ممات کا دخل ہے۔ بیماری کے فضائل ایسے دل نشین پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ صحت یاب ہونے کو دل نہیں چاہتا'' (۲)

یہاں پر مصنف نے کردار عبدالودود بیگ کو دوسری بار ''متعارف'' کرایا ہے۔ ہمزاد کے بعد تیماردار اور وہ بھی ایسے اچھوتے اور نئے انداز سے کہ گویا یہ قاری کا بہت پرانا اور جانا پہچانا کردار ہے۔ دراصل اس کردار کے ذریعے مصنف نے معاشرے کے اُس گروہ کے نقوش ظاہر کئے ہیں جو ہر بات کو اپنی نظر سے دیکھتے ہیں اور وہ خود پر عاشق ہوتے ہیں۔ اپنی بات کو منوانا اور حق ثابت کرنا اُن کی عادت بلکہ ضد ہوتی ہے۔ مرزا بھی غم گساری کے لئے عجیب منطق رکھتا ہے کہ دراصل بیماری و علالت ایک طرح سے غنیمت ہے۔ انسان تندرست نہ ہو تو کافی کمزوریوں اور بداعمالیوں سے محفوظ رہتا ہے۔ یہاں پر مصنف یہ نکتہ سمجھانا چاہتا ہے کہ لوگ شفایابی کی حالت میں ''فراموشی و ناشکری'' کے عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جب لوگ بیمار ہو جاتے ہیں تو بہت کچھ یاد آنے لگتا ہے اور توبہ توبہ کرتے ہیں مگر جیسے ہی تندرستی دستیاب ہو تو جرائم کرنے لگتے ہیں، انانیت کے شکار ہو کر خود ہی کو برتر خیال کرتے ہیں اور دوسروں کی بالکل پروا نہیں کرتے۔ اس صورتحال کو مصنف نے یوں بتایا ہے۔

> "وہ جب تندرستی کو اُم الخبائث اور تمام جرائم کی جڑ قرار دیتے ہیں تو مجھے رہ کر اپنی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل ضرور پیش کرتے ہیں کہ جن ترقی یافتہ ممالک میں تندرستی کی وبا عام ہے وہاں جنسی جرائم کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے'' (۳)

مشتاق احمد یوسفی کا ہمزاد بہت حساس واقع ہوا ہے۔ غور کیجئے تو وہ الٹا وضاحت کرتا ہے۔ آج کل سماج کے وہ لوگ اکثر ''بے وقوف کردار'' کہلاتے ہیں جو روایتی اور وقتی مصلحتوں کے اسیر نہیں بنتے مثلاً ہمیشہ سچ بولو کی جگہ وہ سدا جھوٹ

بولنے کی تاکید کریں گے' وقت کی قدر کرو' کو وہ وقت کی بے قدری کرو' میں بدل دیتے ہیں' محنت کی عظمت پر یقین کی بجائے وہ محنت پر شک کو ترجیح دیتے ہیں۔ دراصل یہ طبقہ حساسیت میں انتہا پسند ہوتا ہے اس لئے یوں اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے، مگر بینا نظر و دانا دل والے ان کا مطلب جان لیتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی نے مرزا عبدالودود بیگ کو سامنے لاکر یہ دکھایا اور بتایا ہے کہ ہمارے چارسو ایسے لوگ ضرور پائے جاتے ہیں جو بظاہر مزاحیہ بلکہ مسخرے لگتے ہیں مگر ایسا نہیں ہوتا ، وہ باقاعدہ طور پر ایک باوقار طبیعت اور سنجیدہ دل رکھتے ہیں، وہ کسی بھی طریقے سے سماج کی فلاح کے لئے اپنا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں، وہ مختلف روپ دھار کر سامنے آتے ہیں اور خاص کر وہ لبادہ اوڑھ لیتے ہیں جو موجودہ لوگ پسند کرتے ہیں، یوں "چراغ تلے" کے پہلے کھٹ مٹھے مضمون ''پڑیے گر بیمار'' میں مرزا عبدالودود بیگ کو مصنف نے ایک ایسے زندہ اور توانا کردار میں پیش کیا ہے جو واقعی ہمارے معاشرے میں متحرک ہوتے ہیں۔ آگے اسی مضمون میں ڈاکٹر اور ایک زنانہ اسٹینوگرافر کی علاج والی صورتحال کو مصنف نے مرزا عبدالودود بیگ کی زبانی یوں بیان کیا ہے۔

> ''انہوں نے تصدیق کی کہ ڈاکٹر صاحب امریکی طریقہ سے علاج کرتے ہیں اور ہر کیس کو بڑی توجہ سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ سینڈل کے علاوہ ہر چیز اتروا کر انہوں نے اسٹینوگرافر کے حلق کا بغور معائنہ کیا۔ علاج سے واقعی کافی افاقہ ہوا اور وہ اس سلسلے میں ابھی تک پیٹھ پر بنفشی شعاعوں سے سینک کرانے جاتی ہے'' (۴)

اب یہاں پر لعن طعن کو مزاح کے پردے میں چھپا کر ڈاکٹر، امریکی طریقہ علاج اور زنانہ مریض پر طنز کیا گیا ہے کہ حلق کی بیماری کے لئے باقی چیزیں اتروانا کیا معنی رکھتے ہیں یعنی مصنف یہ بتانا چاہتا ہے کہ ہم اپنی بقا کو غیروں کے ہاں تلاش کرتے ہیں، یوں اگر کچھ کسر رہ گئی ہے تو وہ بھی الٹ پلٹ اور ایسا ہم خود کرتے ہیں کہ ماضی کی روایات، پاکدامنی، نفاست اور پاکیزگی کو بھول کر جسمانی، ذہنی، فکری، روحانی اور اخلاقی گندگی میں آئے روز غرقاب ہو رہے ہیں مگر مجال ہے کہ اپنی حالت خود سنوارنے کا سوچ بھی ہو، یوں ذلت و رسوائی ہی ہمارا مقدر ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ چونکہ مصنف کا سایہ ہے اور خاص کر نفس لوامہ ہے اس لئے طنز و مزاح کے فرغل میں وہ عبدالودود بیگ کے ذریعے سے قاری کو اکساتا اور ابھارتا ہے کہ وہ فوری طور پر نفس امارہ کو مار کر اور نفس لوامہ سے بڑھ کر نفس مطمئنہ کے منزل پر پہنچ کر جائیں۔'' چراغ تلے'' میں مرزا عبدالودود بیگ کے کردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جہاں اس کردار کے اور پہلو خاصے جاندار ہیں وہاں اس کا کمال یہ ہے کہ اپنی ہی بات پر زور دیتا ہے، اُنہیں حق و سچ ثابت کرنے کے لئے مختلف تاویلوں اور دلیلوں کا سہارا لیتا ہے، چاہے اُن کا ہم آہنگ ہونا ممکن ہو یا ناممکن۔ مرزا صاحب اس طور سے وار کرتا ہے کہ ہنسی بھی رکتی نہیں ہے اور سوچ کی لکیریں بھی ضرور سر اُبھارتی ہیں۔ مضمون ''موذی'' کے یہ الفاظ دیکھئے۔

> ''مرزا کرتے وہی ہیں جو اُن کا دل چاہے لیکن اُس کی تاویل عجیب و غریب کرتے ہیں۔ صحیح بات کو غلط دلائل سے ثابت کرنے کا یہ ناقابل رشک ملکہ شاذ و نادر ہی مردوں کے حصے میں آتا ہے''۔ (۵)

کہتے ہیں کہ دیکھتے سب لوگ ہیں مگر سمجھتے بعض لوگ ہیں۔ اب ہر معاشرے میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے، ہر سطح پر اتار چڑھاؤ آتے ہیں، نشیب و فراز کا عمل برسوں سے جاری ہے مگر ہر خبر کے ہاں چھپا ہوا ''خبر'' اور ہر پیغام کے اندر

موجود ''پیغام'' کو پالینے کے لئے خاص بینائی ودانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔مشتاق احمد یوسفی نے اس موڑ پر مرزا عبدالودود بیگ کو ایسے روپ میں پیش کیا ہے کہ اگر قاری زرا غور کریں تو مرکزی نکتے تک رسائی حاصل کر لے گا۔ ہمارے معاشرے کے ہر گوشے میں ایسے ایسے راہنما و پیشوا ہیں جو کہ سب کے سامنے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں ،سامنے سے کچھ اور پھر بعد میں کچھ اور نقاب اوڑھ کر دونوں ہاتھوں سے لوٹ مار کرتے ہیں،قوم وملک کے سودا تک کو اپنا حق گردانتے ہیں اور جب پکڑے جاتے ہیں تو عجیب عجیب پینترے بدلتے ہیں ،عوام کو مزید سبز باغ دکھاتے ہیں، مختلف حیلے حوالوں سے اپنے آپ کو بے گناہ اور معصوم ظاہر کرتے ہیں، جو غلط اور شیطانی کرتوتوں میں ملوث ہیں تو انہیں ٹھیک اور درست ثابت کرنے لئے کبھی کیا اور کبھی کیا کہتے اور کرتے رہتے ہیں، یوں مصنف نے اس مرحلے پر اُن لوگوں کے چہرے سے نقاب اُتارا ہے جو اصل میں دو غلے ہوتے ہیں اور ہمیشہ دوغلی چال چلتے ہیں۔ یہاں پر مرزا عبدالودود بیگ کو سگریٹ کا عادی بتایا گیا ہے مگر مصنف نے حسب معمول اس طرح کے الفاظ واسلوب کا سہارا لیا ہے کہ ذہن واقعی شگفتگی اور تازگی محسوس کرتا ہے۔ یہ الفاظ دیکھئے۔

> ''اگر میں نے بر بنائے مجبوری سگریٹ پینے کی قسم کھالی تھی تو آپ سے اتنا بھی نہیں ہوا کہ زبردستی پلا دیتے۔ میں ہوں مجبور مگر آپ تو مجبور نہیں'' (٦)

ہم اگر اپنے آپ اور اپنے گھر سے شروعات کر کے تمام سماج پر نظر دوڑائیں تو یہی تماشا برپا ہے کہ محفل اور موضوع کی مناسبت سے ہم آہنگی اور مصلحت کے بہانے ہر قسم کی گفتگو اور وعدے کرنا عام روش بن چکا ہے اور خاص کر اُن چیزوں کو علاج بتاتے ہیں جن سے کسی کو بھی فائدہ نہ ملے، ساتھ ان اشیاء کو ناقص قرار دیتے ہیں جن کا تعلق ہماری ذات اور فائدے کے لئے ہو، یوں حقائق اور سچائیوں کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں جب کہ اللے تللے اعمال واقدامات پر بار بار ''درست'' ہونے کی مہر لگاتے ہیں۔اس طرح ہمارے ہاں ایک بگاڑ کی صورت جنم لیتی ہے۔مشتاق احمد یوسفی نے اپنے اس کردار کی خوبی یا خامی یہ بتائی ہے کہ اپنی بات پر قائم نہیں رہتا اور اپنی دلیل کو جھوٹ اور مداری کی طرح جھرلو دکھا دکھا کر ''مطمئن'' ہو جاتا ہے۔مشتاق احمد یوسفی کے بقول:

> ''ہم نے اکثر یہی دیکھا کہ مرزا پیمبری لینے کو گئے اور آگ لے کر لوٹے'' (٧)

یہاں پر معاشرے میں تضاد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ اور کے مصداق ہمارا ماحول کمزور ٹکروں اور ناتواں حصوں میں منقسم ہے جو آئے روز دلدل میں گر رہا ہے مگر کوئی ایسا جاندار کردار نہیں ہے کہ اس شکست کو فتح میں بدل دے۔مشتاق احمد یوسفی کی عطایہ ہے کہ عام وخاص اور ادنیٰ واعلیٰ کرداروں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا بلکہ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کردار میں اپنے اعلیٰ طرز اور عجیب اسلوب سے جان ڈال دیتا ہے۔یوں اس کا ہر کردار ادھورا اور ناہموار لگتا ہی نہیں۔اس سے مصنف کی ذہنی رسائی اور فکری پہنچ کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔جب مصنف نے مرزا عبدالودود بیگ کو ہمزاد کہا ہے تو ظاہر ہے چار سو کسی بھی سطح 'گوشے یا سمجھا میں جو بھی بات' حرکت ،قدم عمل یا سوچ مصنف کو ناگوار

گزرے وہاں وہ خود اس کردار کے روپ میں ظاہر ہوگا ،تب اس کے قلم سے طنز ومزاح کے ذریعے ایسے ایسے شگوفے ،لطیفے، باتیں اور حرکتیں صادر ہوں گی کہ اُن سے ایک طرف قاری دلی وفکری طور پر خوشبوئیں حاصل کرے گا اور دوسری طرف اخلاقی وروحانی لحاظ سے بہت اعلیٰ سوچوں سے فیض یاب بھی ہوگا۔مشتاق احمد یوسفی نے تعلیم وامتحان کے ضمن میں تاریخوں کے یاد ہونے یا نہ ہونے کو باقاعدہ ایک المیہ قرار دیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ

''جو سن نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے جو ہم نہ ہوتے تو غم نہ ہوتا''(۸)

مرزا عبدالودود بیگ کی ایک خاصیت یہاں پر یہ بتائی گئی ہے کہ وہ بانگ دھل غلط سن دہرایا کرتا ہے مگر کوئی پریشانی یا پشیمانی ظاہر نہیں کرتا کیوں کہ اس کا عقیدہ ہے کہ بعض استاد یا ممتحن محض اس لیے پاس کراتے ہیں کہ انہیں خود بھی صحیح سن یا تاریخ یاد نہیں ہوتے ،یوں حقیقت کے منافی سن بتا کر کام نکل جاتا ہے۔اب ان جملوں سے بہت نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔میری تحقیق وسوچ کے مطابق سن کو یاد کرنا کوئی باقاعدہ تعلیم نہیں ہے بلکہ یہ ایک طرح سے ذہنی مشغلہ ہے جو بہت وقت طلب اور دماغی ورزش کا متقاضی ہوتا ہے۔اس لئے شعبہ درس وتدریس میں سن کی یاداشت پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے کہ کسی طالب علم نے یوں ہی غلط وبے حقیقت ہندسے بتائے اور ڈگری وغیرہ کا حق دار قرار پایا بلکہ اس سلسلے میں پوری چھان بین اور دیگر شعبوں کی اہمیت کو نہیں بھولنا چاہیئے ۔یہاں پر مرزا ایک ایسا کردار ہے کہ بس اپنی بات کہتا جاتا ہے،مختلف تاریخی واقعات کے غلط سن بتا کر شاباس کا تقاضا کرتا ہے، چاہے وہ صرف اعداد ہی کیوں نہ ہو یعنی ان کا حقیقت سے دور کا واسطہ ہی نہ ہو۔مرزا عبدالودود بیگ اگر چہ اپنی بات کا پکا ہے مگر اس کردار کی باریک بینی سے مطالعہ بتاتا ہے کہ اپنے ہاں کافی ناقص اعمال اور کڑوے کسیلے اقدامات بھی رکھتا ہے جو کہ بعض اوقات اس کردار کو کمزور بنا دیتے ہیں لیکن مصنف کا قلم ایسا انوکھا روش روا رکھتا ہے کہ اس کو ہر دفعہ بری الزمہ قرار دیتا ہے۔اب اگر ہم اردگرد پر نظر دوڑائیں تو ایسے ان گنت افراد سامنے آتے ہیں جو ظاہر وباطن میں کھلا تضاد رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود اشرافیہ کہلاتے ہیں۔مشتاق احمد یوسفی نے مرزا عبدالودود بیگ کو کافی مرتبہ الٹا دکھایا ہے جو کہ اہل بصیرت کے ہاں فلسفی کے نام سے معروف ہوتا ہے اور ایک ایک بات کے لاتعداد رُخ دکھا کر ہر بار "انسانیت" کا نتیجہ صادر کرتا ہے،مثلاً جب مصنف اس کردار سے خانساماں کے ناپید ہونے کا ذکر کرتا ہے تو یہ جواب ملتا ہے

"خانساماں وانساماں غائب نہیں ہورہے بلکہ غائب ہورہا ہے وہ ستر قسم کے پلاؤ کھانے والا طبقہ جو ٹیلر اور خانساماں رکھتا تھا"(۹)

یہاں پر یہ کردار ایک اور منطق سے اپنی بات کرتا ہے، پھر اپنی گفتگو کو بڑھاتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے کہ ایک لحاظ سے خود کام کرنا آسان ہوتا ہے جبکہ دوسروں سے کام کروانا یا نکلوانا خاصا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔دراصل مصنف ہر حالت میں انفرادی واجتماعی اصلاح وفلاح کا شائق ہے، یوں وہ بظاہر ایسے جملے ثبت کرتا ہے کہ جن سے سماج کا ہر طبقہ اپنے اپنے دام کھرے کرتا ہے۔اس لئے مشتاق احمد یوسفی کل پر نظریں جمائے رکھتا ہے تاکہ سماج وحیات سے وابستہ کوئی بھی حصہ تشنگی یا کمی کا شکار نہ ہو۔مصنف کی فکری رسائی اور دانائی گہرائی کہاں تک ہے اور وہ معاشرے کے اتار چڑھاؤ سے کس حد تک آشنا ہے، ہمارے ہاں مختلف طبقات کے صحیح اوقات کیا ہیں ، اس سلسلے میں کتاب اور تمام کرداروں کے

بارے میں مصنف کے اندرونی خیالات سے مستفید ہونا شرطِ اولین و آخرین ہے۔ مصنف ایک جگہ کردار مرزا عبدالودود بیگ سے کہتا ہے کہ یہ خانساماں تم سے یوں بے ہودہ گفتگو کرتا ہے اور تم خاموشی سے سنتے ہو۔ اب جو جو اب ملاوہ دیکھئے کہ:

"میں نے جان بوجھ کر اس کو اتنا منہ زور اور بدتمیز کر دیا ہے کہ اب میرے گھر کے سوا اس کی کہیں اور گزر نہیں ہو سکتی" (۱۰)

اب میرے گھر کے سوا اس کی کہیں اور گزر نہیں ہو سکتی، ایسا جملہ ہے جو بہت ہمہ گیر ہے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ باوقار اور عزت دار لوگ جاہل افراد کے منہ نہیں لگتے بلکہ وہ ہمیشہ اپنی اُڑان اونچی رکھتے ہیں، یہ بھی مردا ہے کہ اگر ایک شخص اپنی کوتاہیوں کو اپنے لئے اثاثہ سمجھتا ہے تو اس کو اپنے حال میں خوش رہنے دو، ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ جو ذائقہ ایک بار کسی کو لگ جائے وہ مرتے دم تک اُس کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اب اس جملے کے واقعی بے شمار مفہوم نکل سکتے ہیں اور یہی مشتاق احمد یوسفی کے اس کردار کی خاص خوبی ہے کہ ہمیشہ معلوم سے نامعلوم اور خواب سے حقیقت تک کے سفر پر چلتا ہے، مگر جو چیز نصب العین ہے وہ ہے اصلاح وفلاح۔ چراغ تلے کا مطالعہ کرتے وقت قاری ہر وقت اسی انتظار میں ہوتا ہے کہ کب مرزا عبدالودود بیگ آدھمکے گا، بس یہی چاہت اس کردار کو یگانہ بنا دیتی ہے۔ اکثر معاشرتی فضولیات وعیش وعشرت کو کسی بھی طرح آشکارہ کیا جائے تو بڑی بات مانی جاتی ہے مگر جب وہ صورتحال آنکھوں میں پھر جائے، آپ اُس سے محظوظ بھی ہو اور نڈھال بھی، تو پھر سوچ کی داریں جنم لیتی ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی نے کردار مرزا عبدالودود بیگ کو آئینے کی مانند روشن دکھایا ہے۔ جس میں ہر کوئی بہت آسانی کے ساتھ اپنا اور سماج کا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔ ایک مضمون "اور آنا گھر میں مرغیوں کا" میں مصنف نے معاشرے میں بگاڑ کی ایک صورت کو یوں دکھایا ہے۔

"صاحب مرغی تو درکنار میں تو انڈے کو بھی دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔ تازے خود کھائیے۔ گندے ہو جائیں تو ہوٹلوں اور سیاسی جلسوں کے لیے دُگنے داموں بیچئے" (۱۱)

اب زرا غور کیجئے کہ مرزا عبدالودود بیگ کی منہ سے یہ خیالات آشکارہ کرنا کیا معنی رکھتے ہیں، کیا یہ سوچ عام نہیں ہے، کیا یہ رویہ ہمارے ہاں جاری نہیں ہے، اس لئے اس کردار کو اردو کے طنزیہ ومزاحیہ ادب میں ایک الگ اور منفرد مقام حاصل ہے کہ یہ تنہا اور اکیلا بالکل نہیں ہے بلکہ یہ کل سماج اور تمام حیات کا ایک طاقتور متحرک کردار ہے، جس کی پہنچ ہر سطح تک ہے، البتہ خاص بات یہی ہے کہ اس کردار کی چال ڈھال ایسی ہے کہ بار بار پڑھنے اور دیکھنے کو دل کرتا ہے۔ راقم کا خیال یہ ہے کہ ایک کردار دراصل اُس دنیا کا عکاس ہوتا ہے جہاں زندگی گزارنے، سجانے، سنوارنے، بگاڑنے اور سمجھوتہ کرنے یا نہ کرنے کے تمام حالات موجود ہوتے ہیں، وہاں پر عصر گذشتہ، زمانہ حال اور وقتِ مستقبل سے مزین ہر قسم کے اعمال سے واسطہ پڑتا ہو، یوں جس جس کونے میں واقعی حیات وزندگی موجود ہو وہ فوری طور پر حاصل کی جائے اور جو جو گوشہ کج رفتاری سے آباد ہو اور انسانی سلوک کے راستے میں رکاوٹ ہو اُن سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔ اب ایسے میں کرداروں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہوتا کیونکہ اسی طرح حال میں رہ کر ماضی کے قصوں اور مستقبل کی کہانیوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ ہمارے سامنے اُن چیزوں کو لا کر رکھ دیتا ہے جو پہلے سے ہمارے لئے آشناء ہوتے ہیں مگر ہم اُن سے اندرونی طور پر آگاہ نہیں ہوتے۔ اس کردار نے کھیلوں کے بارے میں یوں اپنی رائے دی ہے۔

"چھی، ہماری یہ بڑی کمزوری ہے کہ اپنی ٹیم کسی کھیل میں جیت جائے تو اُسے قومی کھیل سمجھنے لگتے ہیں اوراس وقت تک سمجھتے رہتے ہیں جب تک کہ ٹیم دوسرا میچ ہار نہ جائیں"(۱۲)

اس خیال کو دیکھئے کہ کس طرح عام لہجے میں اتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔اب ایسا ہونا روز روز کا تماشا ہے مگراس کردار نے ایک تلخ حقیقت کو شیریں شکل عطا کی ہے۔ ویسے بھی ہر سماج کے اندر بناوٹ اور دکھاوے کی وبا کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتی ہے مگر ہمارے ہاں یہ ایک قومی بیماری بن گئی ہے کہ جو جیتا وہی سکندر اور جو ہارا وہ اُس کا مقدر یعنی فتح کو ہم اپنے کھاتے میں ڈال لیتے ہیں اور شکست کو دوسروں کے نام کر لیتے ہیں۔اسی طرح ایک قسم سے "قومی خیانت وفکری خباثت" کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اگر مرزا عبدالودود بیگ کی اس خاصیت پر غور کریں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آج کل کے مادہ پرست دور میں حق دار کو حق ملنا بہت مشکل ہے کیونکہ اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ ایک کی محنت پر دوسرے لوگ "ہستیاں" بن جاتی ہیں، جبکہ اصل کردار کو زندہ درگور کیا جاتا ہے۔مرزا عبدالودود بیگ کے کردار میں اجنبیت کا مادہ نہیں ہے۔مصنف نے کمال ہوشیاری سے اس کردار کو ہر آدمی کا دوست اور ہم آواز بنالیا ہے۔ ویسے بھی کردار کی تعریف ایک یہ بھی ہے کہ وہ گورکھ دھندوں اور کج روی کا شکار نہ ہو، تاکہ اُس کے ذریعے قلم کار کا اصل مدعا ومقصد آسانی سے سمجھ میں آجائے،اسی کردار کا یک جملہ پڑھیئے۔

"بے پردگی کا خاص انتظام ہوگا ضرور آنا"(۱۳)

کرکٹ کے حوالے سے ایسے فول کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ اگر غور کریں تو چاہے مقامی، قومی یا بین الاقوامی سطح پر کرٹ میچ ہو تو واقعی بے پردگی کا سماں باندھے رہتا ہے،اس سے مصنف ثابت یہ کرنا چاہتا ہے کہ کرکٹ اور کھیل میں ہم بلندی کی طرف اور اخلاقی واسلامی لحاظ سے ہمارا سفر پستی کی طرف رواں دواں ہے جو کہ ایک بڑا المیہ ہے۔کھیلوں میں جو برہنگی عام ہے اُن سے ہمارا معاشرہ اور قومی تشخص بری طرح زوال کا شکار ہے مگر کھیل و کرکٹ کی طرف دھیان خوب جاری ہے جبکہ اس کو جدیدیت کے کھاتے میں ڈال کر فراموش کر دیا جاتا ہے۔مرزا عبدالودود بیگ کے ذریعے مصنف ایک اور رُخ کی وضاحت کرتا ہے کہ کرکٹ آج کل " کھیل "بن گیا ہے، جس کا صحیح تعلق صرف "تماشے اور اداکاری" سے رہ گیا ہے۔آج کل کرکٹ میں کھیل اسپرٹ کا فقدان زوروں پر ہے۔قومی تشخص کی بجائے ذاتی پہچان کو اولیت حاصل ہے۔کوئی کھلاڑی یہ نہیں دیکھتا کہ میری حیثیت اور کردار قومی لحاظ سے کیا ہے اور میں اپنے ملک وقوم کے لیے کیا خدمت سرانجام دینے کا اہل ہوں، بلکہ وہ صرف "ان" ہونا چاہتا ہے، چاہے زیرو کارکردگی کیوں نہ ہو۔ مضمون" کرکٹ "میں مرزا عبدالودود بیگ کے یہ الفاظ دیکھئے۔

" کہو پسند آئی؟ کون؟ کدھر؟ ہم نے پوچھا۔ہمارا ہاتھ جھٹک کر بولے، نرے گاؤدی ہو تم بھی! میں کرکٹ کی اسپرٹ کی بات کر رہا ہوں۔(۱۴)

دراصل یہاں پر اس کردار کے واسطے کرکٹ کھیل پر لعن طعن کے تیر برسائے گئے ہیں، مگر مصنف نے وہی نمکین اور میٹھا لہجہ استعمال کیا ہے ساتھ بہت پتے کی بات بتائی ہے کہ آج کل کرکٹ اور کھیل واقع ترقی کر رہا ہے مگر کھیل اسپرٹ روز روز ناپید ہو رہا ہے۔ چراغ تلے کا مرزا عبدالودود بیگ ایک انوکھا اور من چلا کردار ہے یہ کبھی تھکاوٹ کا شکار نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو ہر میدان کا "مرد میدان" سمجھتا ہے۔ ہمیشہ وہ بات کرتا ہے جو اصل ہوتی ہے جسے زبان

پر لانا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم اکثر کہتے ہیں ہ ہم نے فلاں فلاں کام کر کے ایک مثال قائم کی ہے، اب جو تنخواہ اور اُجرت ہم نے وصول کی ہوئی ہوتی ہے اُس کا ذکر تک نہیں کرتے، کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے ملک کے لیے یہ کیا اور وہ کیا مگر اسی ملک نے ہم کو جو شناخت دی، وقار دی، عزت دی، چاہت دی اور خاص کر قومی تشخص دی اُس کو فراموش کرتے ہیں۔ اس طرح مرزا عبدالودود بیگ کا یہ انداز دیکھئے۔

"زبیر: لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر آرٹ کا اصل موضوع کیا ہے؟ مرزا "حقیقت عرف عورت" (۱۵)

دیکھا کہ مرزا کیسے اندر کی بات نکالتا ہے۔ وہ معمولی معمولی باتوں سے ایک نئی دنیا کی تخلیق کرتا ہے اور دوسری خاص بات یہ کہ بڑی سے بڑی بات کو عام اور آسان طرز میں فوری طور پر سامنے لاتا ہے۔ آرٹ دراصل فن وفنکاری کا ایک نادر جوہر ہوتا ہے۔ اس کا تعلق حق وحقیقت کی بازیافت اور اصلیت و باطنیت کی تصویر کاری سے ہوتا ہے۔ ایک جز میں کل کا وجود سمانا، ایک نکتے سے ساری صورتحال آشکارہ کرنا اور ایک گوشے کو دکھا کر تمام عالم کو دکھانا آرٹ ہوتا ہے۔ مصنف نے کردار مرزا عبدالودود بیگ کے ذریعے یہ بتایا ہے کہ آج کل آرٹ نمائش وکماؤ کا ایک وسیلہ بن گیا ہے۔ اصل منصب چھوڑ کر واہیات کو عام کرنا آرٹ بن گیا ہے۔ اپنے آپ کو، اپنے کلچر کو، اپنی تہذیب کو، چال ڈھال کو اور خاص کر خواتین کو ننگا رکھنا آج کل ایک فیشن بن گیا ہے جو کہ جدید دنیا میں آرٹ کہلاتا ہے۔ آرٹ کے نام پر جو چاک دامنی عام ہے مصنف کو اس سے بڑی تکلیف ہے۔ اس لئے مرزا عبدالودود بیگ کو سامنے لاکر جدید آرٹ کو آئینہ دکھایا گیا ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ ایک جیتا جاگتا اور حساس کردار ہے۔ جہاں اُسے کج خلقی اور کج روی دکھائی دی فوراً ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اگر چہ وہ اپنا موقف طنز ومزاح کے پیرایے میں بیان کرتا ہے مگر اس کے لہجے کی تلخی صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہ انداز بیان ملاحظہ کریں۔

"مرزا" آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر آسکتا نہیں" (۱۶)

یعنی خیالی آرٹ واقعی "قیاسی" ہوتا ہے کہ جو کچھ دکھایا جارہا ہے اُن کی حقیقت زبان پر آنہیں سکتی اور جو اصلیت ہوتی ہے وہ گم تصور کر کے صرف نظاروں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ دراصل یہاں پر تجریدی آرٹ کو بہت محدود کر کے دکھایا گیا ہے۔ اس نکتے کو مرکزی جان کر تمام معاشرے پر نظر دوڑایئے تو یہاں پر تقریر بازی اور بیان بازی عام ہے، اپنا کام نکالنا اور دوسروں کو بے وقوف بنانے کا فن ہر جگہ موجود ہے، کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو خود سے انصاف کر سکے، اپنے آپ کو رول ماڈل ثابت کرے۔ اس لئے مصنف نے مرزا عبدالودود بیگ کو ایک ہمہ دان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں سلیمان اظہر جاوید یہ کہتے ہیں۔

> "مرزا عبدالودود بیگ اہم کردار ہے، جس کو انہوں نے اپنا ہمزاد قرار دیا اور اس کی عمر واقبال میں ترقی کی دُعا کی ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ یہ ان کا ہمزاد ہے۔ اسی کردار سے اُس نے بڑے بڑے کام لئے ہیں۔ جہاں بھی ان کی بات گر رہی ہو، مرزا نمودار ہوتے ہیں۔ طنز کے نشتر کو شدید کرنا ہو تو مرزا ہی کام آتے ہیں، کوئی بات غیر معمولی بے تکلفی کے ساتھ اور کسی رورعایت کے بغیر کہنی ہو تو یہ مرزا ہی کا ذمہ ہوتا ہے مختصر یہ کہ مرزا کا کردار بے حد جاندار اور بہت زیادہ بھر پور ہے" (۱۷)

الغرض مشتاق احمد یوسفی کی تمام تخلیقات اور خاص کر "چراغ تلے" میں مرزا عبدالودود بیگ کا کردار ہر جگہ چھایا ہوا ہے۔ اس کردار کے بغیر مصنف کے خیالات واحساسات کو "مثالی" نہیں کہا جاسکتا، آدمی تا انسان، گھر تا معاشرہ اور مقامی حد سے بین الاقوامی سطح تک اس کردار کا ہونا اپنی جگہ پر ثابت ہے۔ اگر چہ مصنف نے چراغ تلے کے مضامین کو کھٹ میٹھے کہا ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرزا عبدالودود بیگ کو تخلیق کر کے ان مضامین کو دنیا جہان کا نقشہ اور عکس بنا دیا ہے اور جب ہم اس کردار کو اپنے ہاں دیکھتے ہیں تو دراصل خود کو اور ان چہروں سے آشنا ہو جاتے ہیں جو سامنے آتے بھی نہیں اور صاف چھپتے بھی نہیں۔ یوں قبل اس کردار کے آنے سے ہم دگرگوں حالات کے شکار رہتے ہیں مگر بعد شناسائی مرزا عبدالودود بیگ، ہم واقعی بہت کچھ جان لیتے ہیں جن سے واقعی ہم بہت مسرت اور فراست بھی حاصل کرتے ہیں جو زندگی گزارنے اور خود کو دیکھنے کے گر سکھاتی ہے۔ اس لئے اس کردار کو مسخرہ قرار دینا یا محض مزاحیہ تصور کرنا قطعاً درست نہیں ہے بلکہ جس طرح مشتاق احمد یوسفی اپنی بصیرت وذکاوت سے طنزیہ ومزاحیہ اردو ادب میں دبستان یوسفی کے نام سے معروف ہے اسی طرح اُس کا ہمزاد مرزا عبدالودود بیگ بھی کردار نگاری کے حوالے سے بہت اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مشتاق احمد یوسفی، چراغ تلے، مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبر نمبر ۲ کراچی، مئی ۱۹۹۳، ص ۱۷

۲۔ ایضاً، ص ۲۷

۳۔ ایضاً، ص ۲۸

۴۔ ایضاً، ص ۳۵

۵۔ ایضاً، ص ۶۷

۶۔ ایضاً، ص ۶۸

۷۔ ایضاً، ص ۶۸

۸۔ ایضاً، ص ۷۹

۹۔ ایضاً، ص ۸۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۹۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۳۳

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۴۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۶۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۷۲

۱۷۔ سہ ماہی، شبیہ (مشتاق احمد یوسفی نمبر)، جنوری/مارچ، ۱۹۹۶ء، ص ۱۴۴